بسیا ودود خی ندوی

سلسلہ اشاعت نمبر

ہماری قومی سیرت

کے

کمزور پہلو

از

ابو الحسن علی

ادارۂ تعلیمات اسلام

نمبر ۲۳ - امین آباد پارک لکھنؤ قیمت ۲ر

ہماری قومی سیرت کے کمزور پہلو

مسلمانوں پر تنقید کرنا اور ان کے کمزور پہلوؤں کو نمایاں کرنا کسی مسلمان کیلئے قطعًا کوئی خوش گوار کام نہیں ہے اور اس کے لئے کوئی شخص آسانی سے تیار نہیں ہو سکتا، لیکن دنیا کے سب ضروری کام خوشگوار نہیں ہوتے۔ ایک ایسی جماعت کی کمزوریوں کو خاموشی سے دیکھتے رہنا جس سے نہ صرف اس کی اپنی قسمت بلکہ دنیا کی قسمت بھی وابستہ ہے اور جو انجیل کی زبان میں زمین کا نمک ہے جس کی نمکینی کے ضائع ہو جانے کے بعد پھر زمین کو کوئی چیز نمکین نہیں کر سکتی، ایک ایسا ناخوشگوار کام ہے جس کے مقابلہ میں دنیا کی ہر ناگواری، ہر تلخی، ہر طرح کی روحانی اذیت اور ہر قسم کی ذہنی کوفت ہیچ ہے، اور اس کے مقابلہ میں اپنی یا دوسروں کی یہ ناخوشگواری کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

مسلمانوں کی کسی قوم یا ملک کا سلطنت و اقتدار سے محروم ہو جانا، یا مسلمانوں کا عالمگیر سیاسی زوال بہت بڑا حادثہ ہے جس پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے اس کے جو اخلاقی اور ذہنی نتائج ہوتے ہیں، وہ بھی اب کچھ پوشیدہ نہیں رہے لیکن اس سے بدرجہا المناک حادثہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کی

ذہنیت یا نفسیت کسی ایسے سانچہ میں ڈھلنے لگی جو صحیح اسلامی تعلیم و تربیت کا سانچہ نہیں ہے، اور بعض انفرادی عیوب و نقائص، یا منکرین خدا اور منکر آخرت قوموں کے صفات و خصائل، مسلمانوں کی سیرت کا جزو بننے لگیں اور قومی کیریکٹر کی صورت اختیار کرنے لگیں، تحریف دین کی اصطلاح تو پہلے سے موجود ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عملی کوتاہیوں اور ذاتی انحراف سے بڑھ کر کوئی جماعت اصل دین، اس کی کتابوں اور اس کی تعلیمات میں ترمیم و تنسیخ اور رد و بدل شروع کر دے۔ اس کے نتائج انحراف سے کہیں بڑھ کر خطرناک اور وسیع ہوتے ہیں، اور اس کا علاج اور اس صورت حال کی اصلاح تقریبًا محال ہوتی ہے، اس لئے کہ اس تحریف سے اس قوم کے ذہن میں حقائق بدل جاتے ہیں، گناہ عین صواب اور بعض اوقات کارِ ثواب بن جاتا ہے اور ان کو دین کی اصل و حقیقت سے ہٹ جانے یا دُور پڑ جانے کا احساس ہی نہیں ہوتا، بلکہ وہ جو کچھ کرتے ہیں وہی عین دین معلوم ہوتا ہے یہود یوں اور عیسائیوں میں مذہبی طور پر یہی صورت پیش آئی ہے میں اس تحریف دین کے مقابلہ میں اس ذہنی و اخلاقی تبدیلی کو جو ہندوستان کے مسلمانوں میں نظر آ رہی ہے تحریف مسلمین سے تعبیر کروں گا۔ مسلمانوں میں عملی کوتاہیاں کم و بیش ہمیشہ پائی گئیں اور انسانوں کی کسی جماعت کا ان سے یکسر پاک ہونا بہت مستبعد ہے۔ لیکن یہ انحراف تھا۔ مسلمان اس کو غلط سمجھتے رہے اور اسلامی

ذہن وضمیر ہمیشہ اس کے خلاف احتجاج کرتا رہا، اور کبھی مسلمانوں نے اس پر فخر نہیں کیا لیکن اب جو کچھ نظر آرہا ہے اس کو انحراف کہنا مشکل ہے، وہ اس سے کچھ زیادہ وسیع اور عمیق اور اس سے مختلف شکل رکھتا ہے۔ یہ مسئلہ مسلمانوں کے تمام سیاسی، تعلیمی اور اقتصادی مسائل سے زیادہ اہم اور قابل توجہ ہے قومی کیرکٹر ہر قوم کی زندگی میں اس کی مادی دولتوں سے کہیں بڑھ کر بیش قیمت ہوتا ہے۔ بالخصوص مسلمانوں کی اسلامی سیرت، بڑی سے بڑی اسلامی سلطنت اور بڑے سے بڑے قومی ادارہ اور زیادہ سے زیادہ قومی ترقی اور اقتصادی خوش حالی سے زیادہ قیمت رکھتی ہے۔ کسی بڑی سے بڑی قیمت اور عظیم سے عظیم بدل پر بھی اس کے نقصان یا زوال کو گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس پر زوال آگیا یا اس میں کچھ تبدیلی واقع ہو گئی تو بڑی سے بڑی مادی کامیابی اور فتح سے اس کا کفارہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تبدیلی مختلف تاریخی و سیاسی اور تعلیمی و تہذیبی اسباب، بعض مؤثر اور اشتعال انگیز حالات و واقعات اور زیادہ تر قیادت کی کمزوری سے صدیوں میں پیش آتی ہے لیکن جب بدقسمتی سے یہ تبدیلی واقع ہو جاتی ہے تو صدیوں تک اس کا اثر قائم رہتا ہے اور اس کے اخلاقی و اجتماعی نتائج اس قوم کے تمام افراد کو برداشت کرنے پڑتے ہیں خواہ انفرادی طور پر بعض افراد کتنے ہی نیک سیرت ہوں۔

اس موقع پر چند نمایاں کمزوریوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو دینی و اخلاقی

حیثیت سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور جن کو اصل اسلامی سیرت اور اخلاقی تعلیمات سے زیادہ بُعد اور تعارض ہے۔

۱۔ اصول و صداقت پر مصالح و منافع کو ترجیح

ایک نہایت اہم اور گہری اور انقلاب انگیز تبدیلی جو مسلمانوں کی ذہنیت و نفسیات میں اس پچاس سال کے اندر اندر واقع ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ آخرت پر ایمان عملاً کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے، اور اس کے نتیجہ کے طور پر با مستقلاً اصول اور صداقت کے مقابلہ میں منافع و مصالح، آجل کے مقابلہ میں عاجل کو ترجیح دینے کا مرض پیدا ہو گیا ہے۔ اس سے مسلمان ایک با اصول، بلند اخلاق، پختہ سیرت جماعت کے بلند مقام سے گر کر ایک بے اصول، ناقابل اعتبار، ابن الوقت اور مصلحت پرست قوم کی ادنیٰ سطح پر آتے جا رہے ہیں جس کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہیں ہے بلکہ صرف منافع و مصالح اور اغراض و مقاصد ہیں۔ یہ تبدیلی اُس وقت شروع ہوئی جب ہندوستان میں اور تقریباً تمام اسلامی ممالک میں وجہ کسی طرح یورپ کے زیر اثر آئے، مسلمانوں کو مغربی تہذیب، مغربی فلسفۂ اخلاق اور مغربی معیاروں کے قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ مغربی اخلاق فلسفہ، علوم اور سیاست کا ہر طالب علم اور اس زمانہ کا ہر واقف آدمی جانتا ہے

کہ یورپ کا سارا نظامِ زندگی تمامتر مادہ پرستی اور مصلحت جوئی پر مبنی ہے "افادیت" اور "مصلحت بینی" اس نظامِ زندگی کے ریشہ ریشہ میں سرایت کر چکی ہے، سارا یورپ اُس وقت سے جب سے اس نے کلیسا کے اقتدار سے اپنے کو آزاد کر لیا صرف ایک ہی عملی مذہب رکھتا ہے (جس کے خلاف کسی گوشہ میں بھی عملاً کوئی بغاوت نہیں) اور وہ مذہب مادہ پرستی ہے۔ مسلم ممالک میں اس نظام کے غلبہ کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ آخرت کی اہمیت کم ہوتے ہوتے بعض حلقوں میں (جہاں یہ نظام اپنی پوری روح کے ساتھ مستولی ہے) معدوم ہو گئی ہے۔ دنیاوی ترقی اور مادی فوائد و منافع منتہائے نظر بن گئے ہیں۔ اصولی و اخلاقی معیار منافع و فوائد کے مقابلہ میں اپنی اہمیت بالکل کھو چکے ہیں مسلمانوں میں اس دعوت کے علمبرداروں نے ترقی (یعنی دنیاوی ترقی) پر اتنا زور دیا اور اس شد و مد اور بلند آہنگی سے مادی ترقی کی دعوت دی کہ بالارادہ یا بلاارادہ آخرت اور امورِ آخرت کی اہمیت کم ہو گئی، بلکہ بعض اوقات انھوں نے اس نظام اور ان افکار کی تضحیک و تنقیص کی جس میں دنیا کے مقابلہ میں آخرت کی اہمیت زیادہ تسلیم کی گئی تھی اور مسلمانوں کو دنیا پرست اور آخرت سے غافل ہونے سے روکنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اُن جملوں اور اُن تقریروں اور تحریروں کا مذاق اڑایا گیا اور ان کی ہجو کی گئی جن میں دنیا کو متاعِ قلیل اور متاعِ غرور

کہا گیا تھا۔ دنیا پرست، مادہ پرست اور منکرِ آخرت قوموں اور ملکوں (خاص طور پر ایک قوم اور ملک) کو مسلمان نوجوانوں کے سامنے ایک بلند نمونہ اور معیارِ کامل کے طور پر پیش کیا گیا جو ہر تنقید سے بالاتر تھا۔ پھر جو نظامِ تعلیم قائم کیا گیا اس میں انکارِ آخرت کی روح بسی ہوئی تھی، اس کی اساس اخلاق کے مقابلہ میں ظاہری منافع کی ترجیح پر رکھی گئی تھی، اس میں شرافت و اخلاق کے مقابلہ میں خواہشِ نفس اور لذت کا عنصر غالب تھا، وہ تمامتر ایسی قوم اور ایسی تہذیب کے ذہن کی پیداوار تھا جو سر تا پا منکرِ آخرت تھی۔ دراصل یہ کسی مجرد نظامِ تعلیم کی قبولیت کی دعوت نہ تھی اور نہ ایسا ممکن ہے بلکہ یہ ایک پوری تہذیب تمدن و معاشرت اور اخلاق و فلسفۂ اجتماع کی دعوت تھی۔

پھر اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ انھوں نے مسلمانوں کو صاف صاف ہوا کے رُخ پر چلنے اور دریا کے بہتے ہوئے دھارے پر کشتی چھوڑ دینے کی دعوت دی اور صاف صاف کہا کہ

"چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی"

اور "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز"

اس دعوت و تبلیغ میں مسلمانوں کی بہترین قابلیتیں صرف ہوئیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی نظروں میں اصول و اخلاق کی اہمیت بتدریج گھٹتی

چلی گئی اور بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جس کے نزدیک اخلاق و مصالح میں کوئی تقابل نہ تھا اور ہر موقع پر مصالح کو اصول پر ترجیح حاصل تھی۔ وہ ہر وقت بڑے سے بڑے مذہبی اصول، شرعی حکم اور اخلاقی تعلیم کو ایک شخصی منفعت یا قومی مصلحت پر قربان کرنے کے لئے تیار رہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک خاص قسم کی محدود معاشی ترقی کیساتھ ایک عام اخلاقی انحطاط اور بے اصولی پھیل گئی۔ بیسویں صدی کے اس نصف اول میں ہندوستان میں ہمیں مسلمانوں کے کیرکٹر میں پہلے کے مقابلہ میں نمایاں اور محسوس انحطاط نظر آرہا ہے، جو ہر سوچنے سمجھنے والے مسلمان کے لئے حد درجہ تشویش ناک ہے۔ اب ایک اصول اور مذہبی اعتقاد کے مقابلہ میں ذاتی ترقی یا شخصی فوائد کی قربانی کی مثالیں کم سے کم تر نظر آتی ہیں اور وہ بھی زمانہ گزشتہ کی یادگاریں ہیں جو برابر روبزوال ہیں۔ اب تمام مسائل زندگی پر ایک تعلیم یافتہ مسلمان کا طریق فکر اور زاویۂ نگاہ خالص مادہ پرستانہ اور تاجرانہ ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کام میں اسکے لئے کتنی مالی منفعت ہے یا اس کو کس قدر جاہ و اعزاز حاصل ہوگا اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ وہ شرعاً اس کے لئے جائز اور اخلاقاً مستحسن ہے یا نہیں بلکہ اس کا اپنا ضمیر بھی اس سے مطمئن ہے یا نہیں۔ یہ سوالات مسلمانوں کے دماغوں سے ایک عرصہ سے نکلتے جا رہے ہیں یا ان کی اہمیت کم ہو گئی ہے؟

اور ان کی بنا پر کسی مسلمان کو کسی عہدہ یا منفعت یا اعزاز کے قبول کرنے میں قلب و ضمیر کی رکاوٹ کم سے کم پیش آتی ہے خواہ وہ شریعت میں مطلقاً حرام اور اخلاقاً حد درجہ معیوب ہو اور اس کا ضمیر ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے مطمئن نہ ہو۔ بلکہ اب اس کو ایک قومی خدمت سمجھا جاتا ہے اور اسی نقطۂ نظر سے اس کو دیکھا جاتا ہے کیونکہ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جو روپیہ کسی جائز یا ناجائز طریقہ پر کسی فرد کی جیب میں آتا ہے اور اس کے بچوں اور متعلقین کی خوشحالی کا سبب بنتا ہے وہ گویا قومی فنڈ میں جمع ہوتا ہے اس لئے کہ یہ سب مسلمان ہیں، لہٰذا ایک مسلمان کی خوش حالی یا چند افراد کی خوش حالی خواہ وہ کسی قدر ذلت اور احکام مذہب کی صریح مخالفت کے بعد ہی ہو، قومی خوش حالی کے مرادف ہے۔

اس ذہنیت و سیرت اور اس عام اخلاقی انحطاط اور کیرکٹر کی کمزوری کا اثر مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں پر پڑ رہا ہے اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا عیب نظر نہیں آتا، بلکہ اس پر بحث کی گنجائش بھی بہت کم رہ گئی ہے۔ اس کا نتیجہ وہ تمام بے اصولی، تناقض اور اخلاقی کمزوریاں ہیں جن کی مثالیں ہمیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ ہمارے مسلمان اخبار و رسائل میں

(الا ماشاء اللہ) ہر قسم کا خلافِ تہذیب اشتہار شائع کرایا جا سکتا ہے اگر اس کی قیمت ادا کر دی جائے۔ ادبی رسائل میں ہر قسم کے مخربِ اخلاق، حیا سوز، عریاں مضمون، افسانے، اشعار شائع ہو سکتے ہیں، بے حیائی اور اخلاقی بے نظمی کی ہر تحریک کے لئے وہ آلہ بن سکتے ہیں، بدتر سے بدتر فواحش کی اشاعت ان کے ذریعہ سے کی جا سکتی ہے اگر ان کو اس راستہ سے اپنے رسالہ کی کامیابی اور مقبولیت کا ایک فی صدی بھی امکان نظر آئے تو ایسی صورت میں وہ اس کی ہرگز پروا نہ کریں گے کہ ان کی اس حرکت سے خلقِ خدا کی اخلاقی ابتری اور انحطاط کا ۹۹ فی صدی امکان ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان اخبارات و رسائل کے مالک و ایڈیٹر ذاتی طور پر شریف مسلمان ہوں، اور وہ اصولاً ان چیزوں کو اچھا نہ سمجھتے ہوں لیکن اگر آپ اس مسئلہ پر اُن سے گفتگو کریں گے تو وہ صاف کہدیں گے کہ تجارت و صحافت میں اصول مذہب اور اخلاق کی پابندی نہیں کی جا سکتی۔

اخبارات کسی اصول اور صحیح مسلک کی ترجمانی اور صحیح خیالات و افکار کی اشاعت کے بجائے اپنے قارئین اور عوام کے خیالات و خواہشات کی ترجمانی کو اصولِ صحافت سمجھتے ہیں۔

وہ عوام کی ناراضی اور بددلی کو ایک منٹ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتے اور ان کی خوشی اور اپنے اخبارات کی مقبولیت و اشاعت کے لئے ہر قسم کی بے اصولی، ہر طرح کے تناقض اور ہر درجہ کے ابتذال کو گوارا کرتے ہیں مسلمانوں کے مذاقِ سلیم، فکرِ صحیح اور اخلاقِ قومی پر یہ اخبارات بڑی طاقت کے ساتھ اثر انداز ہیں اور مسلمانوں کے افکار و خیالات میں جو عام بے ربطی و تناقض، عام ذہنی انتشار اور اشتعال پذیری پائی جاتی ہے اس میں میرے نزدیک ان اخبارات کا بڑا حصہ ہے۔

مسلمان اہلِ علم اور اہلِ قلم کو آپ ہر کام پر لگا سکتے ہیں اگر اس کا خاطر خواہ معاوضہ آپ اُن کو ادا کریں۔ ان سے خود اُن کے خیالات و افکار کے خلاف سب کچھ کہلوا سکتے ہیں، لکھوا سکتے ہیں اور شائع کروا سکتے ہیں اگر اس کی قیمت ادا کر سکیں۔ بڑے بڑے سنجیدہ اور ذی علم اہلِ قلم و اخبار نویس اور پُرجوش اسلامی نظمیں لکھنے والے شاعروں سے ایسے پروپیگنڈے کا کام لیا جا سکتا ہے جس سے وہ خود بھی متفق نہیں ہیں۔ اگر آپ اُن سے اس بارہ میں استفسار کریں گے تو وہ آپ کو جواب دیں گے کہ "اس میں کونسا مذہبی یا قومی نقصان یا شرعی گناہ ہے؟ یہ تو ایک "بزنس" ہے"۔

ایک شخص ہم کو معاوضہ دیتا ہے اور ہم اس کے بدلے میں اُسے ایک تقریر یا مضمون تیار کر دیتے ہیں۔ گویا ضمیر فروشی بھی ایک شریفانہ تجارت ہے اور تعاون علی الاثم والعدوان (گناہ اور زیادتی پر مدد کرنا) خود کوئی گناہ نہیں۔ حالانکہ یہ دماغی و ذہنی بیسوائی اُس بیسوا عورت کے گناہ سے بدتر ہے جو اپنا جسم کرایہ پر چلاتی ہے۔

جب سے مسلمانوں پر مغربی طرز کی قومیت کا غلبہ ہوا ہے وہ ہر چیز کو قومی ترقی اور قومی مفاد کے نقطۂ نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ اور جن چیزوں کا ارتکاب وہ ذاتی سربلندی اور شخصی منفعت کے لئے کرتے تھے اب اس کو قومی مفاد کے لئے ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ مثلاً اب اُن کے لئے ضروری ہوگیا ہے کہ تمام محکموں اور شعبوں میں ان کا تناسب قائم رہے خواہ وہ آبکاری کا محکمہ ہو یا جاسوسی کا، سودی کاروبار کے نظام ہوں یا فی سبیل الشیطان لڑنے والے نظام۔ غضب یہ ہے کہ وہ کام بھی جس کی حرمت مسلمانوں کے لئے قرآن کی نص قطعی سے ثابت ہے اور جس پر قرآن کی یہ دو آیتیں شاہد ہیں:-

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا

فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا (النساء)

الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا (النساء)

اس کو اسی قومی مفاد اور مسلمانوں کے تناسب اور ان کے قومی تفوق کو برقرار رکھنے کے لئے جائز قرار دیا گیا اور بعض مسلمانوں ہی کی کوشش سے اس میں غیر معمولی کامیابی ہوئی اور ہو رہی ہے۔

ان تمام مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ ہندستانی مسلمانوں کے نزدیک اصول و صداقت پر مفاد و مصالح مقدم ہیں۔ اخلاقی معیار اور اخلاقی حقیقتیں ان کی نگاہ میں وقیع نہیں۔ اصل چیز وہ منافع اور فوائد ہیں جن کا حصول اپنی ذات، خاندان، یا قوم کے لئے ضروری یا فائدہ مند سمجھا جاتا ہے۔ یہ ذہنی کیفیت اور سیرت ایک ایسی ملت کے لئے جو پیغمبروں کی تعلیمات اور اصول کی حامل و امین ہے اور اصول و اخلاق،

سیرت و کردار میں تمام دنیا کے لئے نمونہ و شاہد ہے (وَکَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ)

حد درجہ نامناسب اور غیر مطابق ہے اگرچہ ایک خالص "قوم" کے لئے بالکل مناسب اور عین مطابق ہے، اور اس کا مسلمانوں کو فیصلہ کرنا چاہئے کہ ان کی صحیح پوزیشن کیا ہے؟

یہ ذہنیت و سیرت ہمارے علم میں کم سے کم ہندوستان میں اس پچیس تیس برس کے عرصہ میں نمایاں ہوئی ہے اور اس کو بڑا فروغ اس مغربی قوم پرستی اور موجودہ سیاسی جوش اور دفاعی جذبہ نے دیا ہے جو ان پچھلے برسوں میں مسلمانوں میں پیدا ہوا ہے۔ ورنہ مسلمانوں کی پوری تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ انھوں نے اصول و اخلاق پر بڑے بڑے مصالح و منافع کو ہمیشہ قربان کیا اور ایک اخلاقی اصول یا دینی حکم کی حفاظت کے لئے انھوں نے عظیم الشان سیاسی و معاشی فوائد کو ٹھکرا دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جبلہ کے معاملہ میں ٹھیک یہی طرزِ عمل اختیار کیا تھا جسے ایک خالص قوم پرست کے نقطۂ نظر سے ایک بڑی سیاسی غلطی کہنا چاہئے۔ صرف ایک شرعی حکم (قصاص) اور ایک دینی اصول (مساوات) کے قائم رکھنے کی

خاطر ان کو جبلہ جیسے با اثر والئ ریاست اور غسان جیسے طاقتور قبیلہ کی امداد سے دستبردار ہونا پڑا مگر انھوں نے اس کے لئے اصول میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جبلہ سے ہزار درجہ بڑھ کر طاقتور فرماں روا اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے۔ غسان سے ہزار درجہ بڑی ریاستیں اسلام کے اثر میں آئیں اور شریعت اسلامی میں کوئی تحریف نہیں ہو سکی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کسی سیاسی مصلحت کی خاطر ادنیٰ درجہ کی بھی بے اصولی اور اخلاقی معیار سے انحراف قبول نہیں کیا اور اس کے لئے وہ تمام مشکلات قبول کیں جو انکو اپنی خلافت میں پیش آئیں مگر نظامِ خلافت میں انھوں نے کوئی تحریف نہیں ہونے دی۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوئی سیاسی مصلحت اور قومی مفاد ایک ایسے نظامِ حکومت سے تعاون کرنے پر آمادہ نہ کر سکا جو ان کے نزدیک غلط اور ان کے اعتقاد و اصول کے خلاف تھا۔

ابھی نصف صدی پہلے جب مغربی تہذیب اور مغربی افکار ہندوستان میں مقبول نہیں ہوئے تھے، ہندوستانی

مسلمانوں کا کیرکٹر اتنا مضبوط تھا کہ اعلیٰ قسم کے دینداروں کے علاوہ متوسط درجہ کے بااصول اور وضعدار شرفا ابھی جھوٹ بولنا، اپنے ضمیر اور اعتقاد کے خلاف کوئی کام کرنا یا کچھ کہنا کفر سے کم نہیں سمجھتے تھے اور مرجانے کو اس پر ترجیح دیتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں بدایون کے ایک عالم مولوی رضی اللہ صاحب شریک ہوئے تھے۔ ہنگامہ فرد ہونے پر وہ گرفتار ہوکر مسٹر کارمیکل کلکٹر کے سامنے پیش ہوئے جنھوں نے مولوی صاحب سے عربی پڑھی تھی، جب کلکٹر صاحب نے مولوی صاحب سے پوچھا تو انھوں نے صاف الفاظ میں شرکت ہنگامہ کا اقبال کیا، کلکٹر صاحب کو چونکہ اپنے اُستاد سے ہمدردی تھی اس لئے انھوں نے مقدمہ ملتوی کرکے مولوی صاحب کو کہلا بھیجا کہ وہ جرم سے انکار کر دیں تو چھوڑ دیئے جائیں گے مگر دوسرے روز کی پیشی میں پھر مولوی صاحب نے اقبال جرم کیا اس پر کلکٹر صاحب کو مجبوراً سزائے موت کا حکم دینا پڑا۔ پھر جبکہ اس حکم کی تعمیل میں بندوق سے گولی مارنے کا وقت آیا تو کلکٹر صاحب اپنے جذبات کو ضبط نہ کرسکے اور مولوی صاحب سے رو کر کہا کہ اب بھی اگر آپ شرکت ہنگامہ

سے انکار کر دیں تو میں آپ کو موت سے بچا لوں گا، اسکا جواب مولوی صاحب نے بڑی ترشروئی سے یہ دیا کہ میں تمہاری وجہ سے اپنا ایمان اور اپنی عاقبت خراب کرلوں اور یہ کہکر بخوشی جان دیدی[۱]۔

مولانا محبوب علی صاحب دہلوی نے ہندوستان کی مشہور تحریکِ جہاد (حضرت سید احمد شہید و مولانا اسمٰعیل شہید کی تحریک) میں کچھ اختلاف کیا، بعد میں انگریزوں نے نو گاؤں ضلع میں دینے چاہے مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ یہ میرا اجتہاد تھا۔ میں نے کسی مصلحت سے اختلاف نہیں کیا تھا۔

یہ سیکڑوں ہزاروں میں سے دو مثالیں تھیں شریف خاندانوں اور شرفاء کی بستیوں میں جاکر پوچھئے تو اس قسم کی بہت سی مثالیں آپ سنیں گے۔

سیرت کی صلابت، اخلاق کی استقامت اور اصول کی پابندی کی ان مثالوں کا مقابلہ اِس زمانہ کی بے اصولیوں اور اخلاقی کمزوریوں، ضمیر فروشیوں اور مسلک و خیالات کی نیرنگیوں سے کیجئے، تو آپ کو اس عام قومی انحطاط اور اخلاقی

---

[۱] مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۲۶-۲۵

زوال کا اندازہ ہوگا جو مسلمان قوم میں نظر آرہا ہے اور روز بروز سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ یہ مسلمانوں کی زندگی کا وہ تاریک پہلو ہے جس کو دیکھ کر ایک حسّاس مسلمان کا دل خون ہوتا ہے اور وہ اس تلخ نوائی پر مجبور ہو جاتا ہے جو اُسکے لئے اور پڑھنے والوں کے لئے کوئی خوش گوار چیز نہیں۔

اخلاق و سیرت اس امت کے نظامِ جسم میں قلب کا درجہ رکھتے ہیں۔ لوگ تنومند و فربہ جسم کو دیکھ کر اس جسم کی صحت و طاقت کا حکم لگا دیتے ہیں، اور یہ نہیں دیکھتے کہ قلب کس قدر کمزور اور ماؤف ہے اور کس طرح بتدریج اس کی حرکت بند ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کی ترقی کا اندازہ مردم شماری کے اعداد، ان کے قومی جوش، ظاہری تنظیم اور سرکاری عہدوں کے تناسب سے لگانا بالکل غلط ہے۔ ایک با اصول، دنیا کے لئے ایک پیغام رکھنے والی، اور اخلاق و سیرت میں دنیا کی تمام قوموں کے لئے معیار بننے والی اُمت کی پیمائش کا ہرگز یہ صحیح پیمانہ نہیں۔ ضرورت ہے کہ دیکھا جائے کہ وہ اخلاق و اوصاف جو زندگی کے صحیح عناصر ہیں، اور جن سے اس امت کا تشخص و امتیاز ہے وہ روبانحطاط ہیں یا روبہ ترقی

اور اس کا اندازہ سرکاری کاغذات سے نہیں ہو سکتا، بلکہ مسلمانوں کی عام زندگی اور ان کے قول و افعال سے ہو سکتا ہے۔

بقول اکبر مرحوم ؎

نقشوں کو تم نہ جانچو لوگوں سے مل کے دیکھو
کیا چیز جی رہی ہے، کیا چیز مر رہی ہے

۲۔ مستقل عالمگیر حریف سے غفلت اور بے حمیتی

قدیم ترین زمانہ سے دنیا میں دو مقابل دعوتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک پیروی نفس اور انسان کی مکمل آزادی اور غیر ذمہ داری کی دعوت (اگرچہ اس میں صدہا قسم کی غلامیاں شامل ہیں) دوسرے انسان کی عبدیت، اس کی خدا کے سامنے ذمہ داری و جواب دہی اور وحی و تعلیماتِ پیغمبر کی پیروی کی دعوت۔ پہلی دعوت کا نام اسلام کی وسیع اصطلاح میں جاہلیت ہے، اور دوسری دعوت خود اسلام کی ہے۔ ان دونوں دعوتوں کی دنیا کی مختلف جماعتیں اور قومیں اپنے اپنے وقت میں علمبردار رہیں۔ ساڑھے تیرہ سو برس سے دوسری دعوت (اسلام) کی امامت قیامت تک

کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کے نام لکھدی گئی، اور پہلی دعوت کی قیادت وقتاً فوقتاً دنیا کی مختلف جاہلی قومیں اور تہذیبیں کرتی رہیں یہاں تک کہ تقریباً دوسو برس سے تقدیر الٰہی نے اس کی قیادت و امامت کا فیصلہ یورپ کی عیسائی قوموں کے حق میں کیا۔ اس وقت سے مسیحی (لیکن دراصل مادی) یورپ نے جاہلیت کی عالمگیر نمایندگی اور ایسی طاقت اور ایسے اسلحہ کے ساتھ اُس کی قیادت کی کہ اس سے صدیوں پہلے ہمارے علم میں کسی قوم نے نہیں کی تھی۔ طبعی طور پر زندگی کے ہر شعبہ اور تمدن دُنیا کے تقریباً ہر میدان میں ان دونوں مقابل دعوتوں اور قوموں کے نمائندوں اور علمبرداروں کا تصادم پیش آیا۔ لیکن مختلف علمی، ذہنی اور سیاسی اسباب کی بنا پر جن کی وضاحت بہت تفصیل طلب ہے، دوسری دعوت (اسلام) کے نمائندوں نے محض اپنی کمزوریوں کی بنا پر یورپ کے مقابلہ میں شکست کھائی۔ ان کے اعلیٰ درجہ کے سرسبز اور اہم ممالک اُن کے ہاتھوں سے نکل کر یورپین قوموں کے قبضہ میں چلے گئے۔ انکا عالمگیر سیاسی اقتدار ختم ہوگیا، سمندروں اور خشکی پر سے اُن کا

تفوق اُٹھ گیا۔ ان کی بین الاقوامی ساکھ جاتی رہی اور اُن کو تقریباً دنیا کے ہر حصہ میں اور خود اپنے ممالک میں بدترین قسم کی غلامی اور قومی ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر رفتہ رفتہ ان کے دماغ بھی مفتوح اور غلام ہونے لگے۔ مغربی تہذیب نے اسلامی تہذیب پر حملہ کیا، مسلمانوں کے قومی اوصاف اور اخلاقی محاسن جو ان کی سلطنتوں اور شاداب ملکوں سے زیادہ بیش قیمت تھے ایک ایک کرکے مٹانے شروع کئے اور اُن کی جگہ بدترین انسانی عیوب اور اخلاقی کمزوریاں جو بُت پرست یونان و روم اور تاریک یورپ اور ملحد نشاۃِ ثانیہ سے اسکے حصہ میں آئی تھیں اُن پر مسلط کر دیں۔ پھر انھوں نے ان مفتوحوں کے دین و ایمان پر حملے شروع کئے، ان کی دینی تعلیمات اور ان کے اصول، و احکام شریعت کا استہزا کیا، ان کو بسا اوقات تثلیث پرست اور بعض اوقات ملحد و بے دین بنانے کی کوشش کی اور ان میں خود بڑی تعداد میں ایک ایسی با اثر جماعت پیدا کر دی جو ان کے دین و تہذیب سے باغی تھی اور جو اندر اندر اُن کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کی کوشش میں تھی غرض فاتح نے مفتوح کو ہر طرح سے غیر مسلح، غیر منظم اور ناتواں

کردیا اور اس کے ہر سرمایہ اور ہر ملکیت کو تاوانِ جنگ یا مالِ غنیمت میں وصول کرنے کی کوشش کی۔ فاتح نے اپنی ذہانت اور دور بینی سے اس حقیقت کا پورے طور پر ادراک کیا کہ اس زمین کے اوپر مسلمانوں سے بڑھ کر اس کا کوئی حریف نہیں، اسلئے یا تو اس نے اس حریف کا سر کچلنے کی کوشش کی اور جہاں اس سے یہ نہ ہو سکا وہاں اس نے اس حریف کو اپنا مستقل حلیف اور بدرجہ مجبوری بے ضرر خادم بنانیکی کوشش کی۔

یورپ کی قوموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی اس مکمل شکست اس مغلوبیت و ذلت اور اس نقصانِ عظیم کا جو ان کو پہنچا طبعی و نفسیاتی اثر کیا ہونا چاہئے تھا؟ ہر صحیح الفطرت انسان کہے گا کہ مسلمانوں کے دل میں یورپ کی قوموں کی طرف سے سخت عناد اور جذبۂ انتقام پیدا ہونا چاہئے تھا، اور اُن کو بھی ان قوموں کو اپنا مستقل حریف، حقیقی مدمقابل اور عالمگیر دشمن سمجھنا چاہئے تھا، اور اس کی کوشش کرنی چاہئے تھی کہ وہ مقابل دعوت کی عالمگیر نمایندگی کی طاقت سے محروم ہو جائے، اس کا اقتدار اس حد تک ختم ہو جائے کہ اس کی تحریک و دعوت میں کوئی کشش اور کمزور انسانوں کے لئے

کوئی کشمکش باقی نہ رہے اور دنیا میں دو دعوتیں برابر کی باقی نہ رہیں بلکہ صرف ایک دعوت رہے اور وہ دعوت الی اللہ ہو۔

حتی لاتکون فتنة و یکون الدین کلہ للہ	یہاں تک کہ فتنہ (کفار کا غلبہ) باقی نہ رہے اور دین خالص اللہ کا ہو جائے۔

ان کی دعا یہ ہونی چاہئے تھی:۔

ربنا انك آتیت فرعون وملأہٗ زینة واموالًا فی الحیوة الدنیا ربنا لیضلوا عن سبیلك ربنا اطمس علی اموالھم واشدد علی قلوبھم فلا یؤمنوا حتی یروا العذاب الالیم۔	اے ہمارے پروردگار تونے فرعون اور اس کے سرداروں کو آرائش اور دولتیں بخش رکھی ہیں، اے ہمارے پروردگار اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ تیرے راستہ سے لوگوں کو بھٹکائیں اے ہمارے پروردگار ان کی دولتوں کو نیست و نابود کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ وہ اسوقت تک ایمان نہ لائیں جب تک کہ دردناک عذاب کو نہ دیکھ لیں۔

ان کو دنیا کے ہر حصہ میں یوروپین تہذیب اور یوروپین

طاقت کو اسی نظر سے دیکھنا چاہئے تھا کہ وہ دنیا میں دعوتِ جاہلیت کی علمبردار ہے اور اس کی قوت کی وجہ سے دعوتِ الٰہی کو فروغ نہیں ہوتا۔ ان کی نگاہ میں دنیا کا سب سے اہم مسئلہ یہی عالمگیر مسئلہ ہونا چاہئے تھی اور ہر مسئلہ اسی مرکزی مسئلہ کا جز ہونا چاہئے تھا۔ ان کو ہر ملک میں اپنے کو دعوتِ اسلام کا عالمگیر نمائندہ سمجھنا چاہئے تھا اور ہر ملکی، قومی، سیاسی مسئلہ پر اسی نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہئے تھا اور وہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے تھا جو اس عالمگیر دعوت کے نمایندوں کو شایانِ شان ہے۔ ان کو کوئی ایسا موقف اختیار نہیں کرنا چاہئے تھا جس سے اس عالمگیر حریف اور اس جاہلی تحریک و دعوت کو کسی قسم کی تقویت و امداد حاصل ہو، خواہ محدود ملکی مسائل اور وطنی و قومی مصالح کا تقاضا کچھ ہو۔ ان کو کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کرنا چاہئے تھا جس سے اس نظام کی طرف ان کا میلان اور اس کے علمبرداروں کے ساتھ اُن کا اتحاد اور محبت ظاہر ہو۔

ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار وما لکم من دون اللہ من اولیاء ثم لا تنصرون۔	اور ان لوگوں کی طرف مت جھکو جنھوں نے ظلم کیا ہے ورنہ تم کو بھی آگ لگ جائے گی اور اللہ کے مقابلہ میں تمھارا کوئی مددگار نہ ہوگا اور کسی طرف سے تمھیں مدد نہ مل سکے گی۔

لیکن کس قدر حیرت و تاسف کا مقام ہے رودِ تاسف و تحیر جو بقول حضرت علی "قلب کو مردہ، دماغ کو معطل اور غموں اور فکروں کو بڑھا دیتا ہے" کہ یہ عظیم الشان حقیقت مسلمانوں کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو گئی ہے یہ مسئلہ اپنی اس مرکزیت اور عمومیت کے ساتھ ان کے ذہن سے صاف نکل گیا ہے۔ اپنی اور اپنے تاریخی اور مستقل عالمگیر حریف کی یہ صحیح پوزیشن اُن کی نظر سے بالکل مخفی ہے دو سو برس کی خونچکاں تاریخ جو فتح و شکست اور واقعات و حوادث کا مرقع ہے ان کے حافظہ سے بالکل محو ہو گئی ہے وہ اس حقیقت واقعی کو بالکل بھول گئے ہیں کہ وہ اور مغربی قومیں دو مقابل دعوتوں، دو متضاد نظامِ حیات، اور دو متضاد تہذیبوں کے علمبردار ہیں، اور اس طرح ایک ترازو کے دو پلڑوں کی طرح ہیں کہ جس قدر ایک نیچا ہو گا دوسرا اونچا ہو گا، ان میں سے ہر دعوت کے علمبرداروں کا وجود

اُن کا فروغ اور ان کی طاقت دوسری دعوت کے علمبرداروں کے لئے ایک مستقل مزاحمت، ایک مسلسل خطرہ اور ایک مستمر کشمکش ہے۔ اس امرِ واقعی کا اہلِ مغرب کو پورا شعور ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں کو اس کا احساس نہیں۔ اس حقیقت کو قرآنِ حکیم نے کس صراحت اور بلاغت کے ساتھ بیان کیا ہے:-

یا ایہا الذین امنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء تلقون الیہم بالمودۃ وقد کفروا بما جاءکم من الحق یخرجون الرسول وایاکم ان تومنوا باللہ ربکم ان کنتم خرجتم جہاداً فی سبیلی وابتغاء مرضاتی تسرون الیہم بالمودۃ

اے ایمان لانے والو! تم میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔ تم ان کی طرف محبت کا پیغام بھیجتے ہو اور دوستی کا اظہار کرتے ہو حالانکہ تمھارے پاس جو دینِ حق آچکا ہے اس کے وہ منکر ہیں اور رسولؐ اور تم کو اس بنا پر کہ تم اپنے پروردگار پر ایمان لائے ہو، جلا وطن کرتے ہیں۔ اگر تم میرے راستہ پر جہاد کرنے کی غرض سے اور میری رضامندی کی

وانا اعلم بما اخفیتم وما اعلنتم ومن یفعلہ منکم فقد ضل سواء السبیل ط ان یثقفوکم یکونوا لکم اعداء ویبسطوا الیکم ایدیہم والسنتہم بالسوء وودوا لو تکفرون ۔

(ممتحنہ-۱)

طلب میں نکلے ہو تو ان سے تمہیں دوستی نہ رکھنی چاہئے۔ تم ان سے چپکے چپکے دوستی کی باتیں کرتے ہو حالانکہ مجھے ان سب چیزوں کا اچھی طرح علم ہے جو تم چھپا کر کرتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو۔ اور جو شخص تم میں سے ایسا کرے گا وہ راہِ راست سے بھٹکے گا۔ اگر ان کو تم پر دسترس ہو جائے تو وہ کھل کر تمھارے دشمن ہو جائیں اور تمھاری طرف برائی کے ساتھ دست درازی اور زبان درازی کرنے لگیں۔ اور اس بات کے خواہشمند ہیں کہ تم کافر ہو جاؤ۔

اس موقع پر ایک مسلمان کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے اور اس کے ایمان اور غیرتِ دینی کا تقاضا کیا ہے؟ اس کے لئے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے متبعین کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ ایک ہی آیت کے بعد کہا گیا۔

قد كانت لكم اسوة حسنة
فی ابراهيم والذين معه
اذ قالوا لقومهم انا برآؤ
منكم ومما تعبدون من
دون الله كفرنا بكم وبدا
بيننا وبينكم العداوة
والبغضاء ابدا حتى تؤمنوا
بالله وحده (ممتحنہ-۱)

تمھارے لئے ابراہیمؑ اور جو لوگ اُن کے ساتھ تھے اُن میں عمدہ نمونہ ہے۔ جب انھوں نے اپنی قوم سے کہدیا کہ ہم تم سے اور جن کو تم پوجتے ہو بیزار ہیں، ہم تمھارے منکر ہیں اور ہم میں تم میں عداوت اور بغض ظاہر ہو گیا، جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔

کتنی عجیب بات ہے کہ اہلِ کفر کو تو اس فرق واختلاف کا احساس ہو اور اپنے دین ومسلک کے لئے محبت وغیرت زیادہ ہو اور وہ اپنے مخالفین سے کبھی اتحاد وموالات کے لئے تیار نہ ہوں مگر اہلِ ایمان ذراسی مصلحت سے انکے ساتھ موالات کرنے لگیں۔ اس فرق کو بھی قرآن شریف نے بیان کیا ہے۔

ها انتم اولاء تحبونهم و
لا يحبونكم
(آل عمران)

ہاں تم لوگ ایسے ہو کہ اُن سے محبت کرتے ہو مگر وہ تم سے قطعًا محبت نہیں رکھتے۔

ولن ترضى عنك اليهود
ولا النصارى حتى تتبع
ملتهم۔
(البقرہ)

تم سے یہودی اور عیسائی اس وقت تک راضی نہیں ہو سکتے جب تک تم ان کے مذہب کے بالکل پیرو نہ ہو جاؤ۔

اس تفصیل ووضاحت کے ساتھ نہ سہی لیکن اجمالی طور پر مسلمانوں کے دلوں میں اب سے کچھ مدت پہلے تک بے دین ولامذہب یورپ اور اس کی حیوانی تہذیب ونظام کے لئے نفرت موجود تھی یہ "کافر فرنگی" نفرت وحقارت کے لئے ضرب المثل تھا۔ لیکن ہم کو اس حقیقت کا برملا اظہار کرنا چاہئے کہ اس چالیس برس کے عرصہ میں مغربی تعلیم وتہذیب نے بتدریج اس نفرت کو کم کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ نفرت کے بجائے رغبت پیدا کردی۔ اس تبدیلی کی پوری ایک تاریخ ہے۔ پہلے اس نے مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا کیا، مغرب کا بالعموم تفوق ذہن پر قائم کیا، اس کا پورا نظام نہایت خوشنما اور آراستہ کرکے دکھایا۔ پھر اس کی محبت کو قلب ودماغ کی گہرائیوں میں اس طرح اتار دیا کہ تعلیم یافتہ مسلمان کے لئے اس سے انحراف مشکل ہو گیا۔ یہاں تک کہ

سیاسی طور پر اگر اس کو اس سے اختلاف بھی ہو تو ذہنی اور
تہذیبی حیثیت سے اس کا ربط اس سے قائم رہتا ہے۔ رفتہ
رفتہ مسلمان کی ذہنیت اتنی تبدیل ہو گئی کہ اس کو دنیا میں
اگر اپنا کوئی حلیف اور سرپرست نظر آتا ہے تو وہ صرف
یورپین طاقت۔ اس نے اس حقیقت سے آنکھیں بند کر لیں
جو روزِ روشن کی طرح ہے کہ اس کا اصلی اور عالمگیر حریف
جس سے پہلی صدی ہجری سے اس چودھویں صدی ہجری
تک مسلسل معرکہ آرائی رہی اور جو دنیا کی قیادت اور
اس کی تعمیر نو میں اس کا اصلی رقیب اور مزاحم ہے وہ
یورپ ہے۔ اس نے اس نکتہ کو بالکل نہیں سمجھا کہ جب تک
یورپ کا سیاسی اقتدار دنیا میں قائم ہے اس وقت تک
دین کی دعوت پورے طور پر سرسبز نہیں ہو سکتی۔ اور اسکیں
وہ طاقت اور جذب و کشش نہیں پیدا ہو سکتی جس کی وہ
مستحق ہے۔ جب تک یورپ تنہا دنیا کے لئے مقتدا اور
پیشوا ہے اس وقت تک انسانی محاسن و فضائل اور
اسلام کے معیارِ اخلاق کو فروغ نہیں ہو سکتا اس لئے اسلام
کی اور بالتبع انسانیت کی عین مصلحت یہ ہے کہ یورپ کو

منصب قیادت سے معزول کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور
چونکہ مسلمان ہی دنیا کے اخلاق، اور اصلاح و فساد کے
ذمہ دار ہیں اور وہی دنیا کے محتسب ہیں اس لئے یورپ
کو اس منصب سے ہٹانا تنہا ان ہی کا فریضہ ہے، اور یہ
مسلمانوں ہی کا منصب ہو کہ یورپ کو رہنمائی و سرداری
کے مقام سے ہٹا کر دنیا کی زمام قیادت خود سنبھالیں۔
لیکن افسوس ہے کہ مسلمان مسائل پر اس نقطۂ نظر سے
غور ہی نہیں کرتے اور ان کو اپنی صحیح حیثیت یاد ہی نہیں
وہ یورپ کو پورے طور پر بے نقاب ہو جانے کے بعد بھی
پہچان نہیں سکے۔ ان کی نظر اب بھی محدود اور کوتاہ ہو کر
وہ قومی مصلحتوں اور محدود جغرافی مسائل میں اس عالمگیر
ضرورت کو بھولے ہوئے ہیں اور وہ بہترین فرصت ضائع
کر رہے ہیں جو تاریخ میں صدیوں میں پیش آتی ہیں۔

۲۔ بزدلی اور بے عملی

مسلمانوں پر اس وقت ایک نظر ڈالنے سے ایک عام
ذہنی و نفسی کیفیت نظر آتی ہے جسے پورے طور پر الفاظ میں

ادا کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن شاید قریب تر الفاظ یہ ہوں کہ "کچھ کئے بغیر سب کچھ پا جانے کی خواہش" گویا استعارہ کی زبان میں مسلمان بیٹھے بیٹھے شطرنج کی ایسی چال چلنا چاہتے ہیں کہ دفعۃً بازی مار لیں۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمان سیاست میں دیر میں آئے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے سیاست کا مفہوم محض انجمن آرائی، تجاویز کی منظوری، اظہار رائے اور زیادہ سے زیادہ اظہار ناراضگی سمجھا۔ جس سیاست کی بنیاد آج سے ۳۰-۴۰ سال پہلے پڑی تھی اس کا مزاج اور خمیر تمام تر یہی تھا، بلکہ درحقیقت یورپ میں بھی اُس وقت (جب انتخابی اور جمہوری زندگی کا آغاز تھا) سیاست کا مفہوم اس سے کچھ زیادہ نہ تھا۔ مگر اس کے بعد سے تمام دنیا کے حالات بہت سرعت کے ساتھ بدل گئے۔ اب سیاست نام جدوجہد اور ایثار و قربانی کا ہے۔ مگر مسلمانوں میں تبدیلی بہت دیر میں واقع ہوتی ہے، اور عجیب بات ہے کہ اُن کا سب سے زیادہ بدلنے والا طبقہ سب سے کم بدلنے والا ہے اور سب سے زیادہ متحرک اور ترقی پسند جماعت سب سے زیادہ جامد اور ساکن واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ تحریک خلافت

کے چند سالوں کو مستثنیٰ کر کے مسلمانوں کی پوری سیاسی تاریخ محض جلسوں، تقریروں، تجاویز، بیانات، وفود اور یادداشتوں (میمورنڈم) کی روداد ہے۔ انھوں نے مغربی سیاست کا جو سبق یاد رکھا ہے وہ صرف یہ کہ سیاست نام ہے دماغی ذہانت، قانونی قابلیت، سیاسی حاضر دماغی، اور حُسنِ تقریر کا، لیکن وہ یہ بھول گئے ہیں کہ یہ مجلسی (پارلیمنٹری) سیاست کے لئے تو مفید ہے مگر خارجی اور عملی سیاست اور انقلابی جدوجہد کچھ اور چاہتی ہے اور کبھی کبھی اس کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔

اس تربیت کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں اتنی ذہنی پستی پیدا ہو گئی ہے کہ وہ شماتت (دشمن کی مصیبت پر خوشی) پر اتر آئے ہیں۔ تربص دوائر (گردش زمانہ کا انتظار) ان کا شیوہ ہو گیا ہے۔ اخلاقی طاقت اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ وہ دوسروں کی جرأت و جانبازی اور ایثار و قربانی کا اعتراف بھی نہیں کر سکتے اور اس کے ماننے کے لئے بھی تیار نہیں کہ کوئی قوم کسی صحیح یا غلط مقصد کے لئے کوئی قربانی کر رہی ہے چہ جائیکہ ان میں اس سے

اپنے صحیح اور بلند مقصد کے لئے جدوجہد اور قربانی کا جذبہ پیدا ہو۔

یہ صورتِ حال بھی تشویش کی باعث ہے۔ اسکا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں پر اپنی کمزوری اور ناتوانی کا احساس اتنا طاری کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنے کو کسی جدوجہد اور قربانی کا اہل نہیں سمجھتے اور کسی قسم کے خطرات کے لئے قطعاً تیار نہیں۔ انھوں نے یقین کر لیا ہے کہ مسلمان خربوزہ کی طرح ہیں جس کے لئے ہر حال میں خطرہ ہی خطرہ ہے، اس لئے نہ وہ چھری پر گرنے کے لئے تیار رہیں اور نہ چھُری کو اپنے اوپر گرنے دینا چاہتے ہیں۔ نیز اُن کو دوسری طاقت پر اعتماد کرنے کا ایسا عادی کر دیا گیا ہے کہ وہ خدا پر بھروسہ کرنے اور اعتماد علی النفس کی دولت سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ صورتِ حال وقتی اور عارضی نہیں ہے اندیشہ ہے کہ کہیں ان حالات میں مسلمانوں کی مجاہدانہ روح اور ان کا جذبۂ سرفروشی ایک مدت طویل کے لئے سرد نہ ہو جائے اور وہ توکل علی اللہ اور پھر اعتماد علی النفس کے جوہر سے محروم نہ ہو جائیں۔ مسلمانوں کا اتنا بڑا

نقصان ہے کہ اس کی تلافی آسانی سے ممکن نہ ہوگی۔

مسلمانوں کی یہ اپنے آپ سے مایوسی اور اعتماد علی الغیر، اپنی کمزوری کا ضرورت سے زیادہ احساس اور دوسروں کی طاقت کا ضرورت سے زائد اندازہ، اور اقلیت و اکثریت کے مسائل سے شب و روز کا یہ انہماک فرنگی تعلیم و تہذیب اور مغربی سیاست کا نتیجہ ہے جو مسلمانوں کو ایک جامد قوم دیکھنے کی عادی ہے اور جو اجداد کے طلسم سے کسی طرح نکل نہیں سکتی اور جو ایمان و توکل کی دولت سے محروم ہے۔ اس زہر کا تریاق قرآن و حدیث کی اشاعت ہے جب تک مسلمانوں کی سیاست قرآن و حدیث پر مبنی تھی اور اس کے دماغ و دل اور روح پر ان کا اثر تھا اس میں اتنا عزم و توکل اور خدا کے وعدوں پر اتنا بھروسہ تھا کہ اس سے خارق عادت واقعات صادر ہوتے تھے۔ محمد بن قاسم فاتح سندھ اور طارق بن زیاد فاتح اندلس کے واقعات کے یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کی آیت۔

لا تهنوا ولا تحزنوا وانتم	نہ سُست پڑو اور نہ غمگین ہو تمہیں

الاعلون ان کنتم مومنین۔	بالا و برتر ہو اگر تم مومن ہو۔

اور

کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللّٰہ و اللّٰہ مع الصابرین۔	کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آگئیں اور اللہ صابروں کیساتھ ہے۔

جن لوگوں کے سامنے رہتی تھی اور ان کا اس پر ایمان تھا انھوں نے مٹھی بھر جماعتوں سے ملکوں کو فتح کر لیا اور وہاں کی تہذیب، زبان اور معاشرت کو بالکل بدل دیا۔ آج بھی صرف قرآن و حدیث کی اشاعت ہی مسلمانوں میں اعتماد اور قلب کی طاقت پیدا کر سکتی ہے۔

صحابۂ کرام اور مجاہدین اسلام کے حالات و واقعات کی اشاعت بھی اس نقطۂ نظر سے بہت ضروری ہے خصوصاً ماضی قریب کے عالی ہمت مجاہدین کے سوانح و حالات مثلاً حضرت سید احمد شہیدؒ، مولانا اسمٰعیل شہیدؒ، الشیخ سنوسیؒ، محمد بن عبدالکریم ریفی جنھوں نے قریب تر ماضی میں نہایت قلیل طاقت اور رفقاء کی بہت تھوڑی تعداد کے ساتھ بڑی سلطنتوں کا مقابلہ کیا اور ایمان کی طاقت اور عزم و توکل کا اعلیٰ مظاہرہ

کیا۔ جو لوگ سیاسی تحریکوں سے ہٹ کر مسلمانوں میں تعمیری اور تعلیمی کام کر رہے ہیں ان کو اس ضرورت کی طرف جلد متوجہ ہونا چاہئے کہ یہ مسلمانوں کی کسی سیاسی خدمت سے کم اہم کام نہیں ہے بلکہ یہ مسلمانوں کی سیاست کی صحیح بنیاد ہے اور اسی پر ان کے مستقبل کی تعمیر ہوگی۔

۴۔ شخصیت پرستی اور غیر مشروط اطاعت

مسلمانوں کا ایک بہت بڑا جوہر جس نے کسی غلط چیز کو عام طور پر مسلمانوں پر مسلط ہونے سے روکا اور قیادت کی کسی کمزوری سے یا شخصی رائے اور فیصلہ کی غلطی کی وجہ سے ان کو ہلاک ہونے سے محفوظ رکھا وہ ان کی آزادیٔ رائے اور آزادیٔ ضمیر کا جوہر یا غلط چیز سے انکار کر دینے کی طاقت اور شریعت کا یہ زرین اصول تھا کہ لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق (خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی طاعت صحیح نہیں ہے) اسی کا مظاہرہ تھا کہ حضرت عمرؓ کو برسر منبر ایک بڑھیا اور عرب کا ایک بدو ٹوک دیتا تھا اور وہ اس کے سامنے سر جھکا دیتے تھے۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی

شخصی سلطنت کے بڑے سے بڑے دورِ استبداد و جبر میں بھی مسلمانوں کی آزادیٔ رائے کبھی سلب نہیں ہوئی اور بادشاہوں کے غلط فیصلوں اور خلفاء کی غلطیوں کے خلاف علماءِ وقت نے ہمیشہ آواز بلند کی جس سے دین و شریعت اور مسلمانوں کے عام مزاج و طبائع میں تحریف نہیں ہو سکی۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، سعید بن المسیب، حسن بصریؒ، سعید بن جبیر، امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام احمد بن حنبل، کے واقعات تاریخِ اسلام میں روشن رہیں گے۔

اسلام میں مطلق و غیر مشروط اطاعت صرف اللہ و رسولؐ کی ہے، باقی کسی انسان کی اطاعت غیر محدود اور غیر مشروط نہیں ہے بلکہ اس کی اطاعت اس وقت تک ہے جب تک وہ اللہ و رسول کی اطاعت کرتا ہے۔ کسی خلافِ شریعت فیصلہ اور کسی ایسے حکم کی تعمیل میں جس سے دین اور اُمت کو یقینی طور پر نقصان پہنچتا ہو اطاعت جائز نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ مجاہدین کی ایک جماعت پر ایک صحابی کو سردار بنایا اور لوگوں کو اس کی اطاعت و تعمیل حکم کی تاکید کی۔ راستہ میں سردار کو اپنے ساتھیوں سے کچھ

شکایت پیدا ہو گئی۔ اس نے لوگوں کو حکم دیا کہ لکڑیاں جمع کرو، پھر اس میں آگ لگائی اور الاؤ تیار کیا، پھر لوگوں سے کہا کہ کیا تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری اطاعت و تعمیلِ حکم کی تاکید نہیں کی تھی؟ لوگوں نے اقرار کیا۔ اس نے کہا تو پھر میرا حکم ہے کہ اس آگ میں کود پڑو۔ لوگوں نے اس سے انکار کر دیا اور کہا کہ خودکشی حرام ہے اور فعلِ حرام میں آپ کی اطاعت ہمارے لئے ضروری نہیں۔ اُس نے آنحضرتؐ سے شکایت کی۔ آپ نے لوگوں کے فعل کی تصویب فرمائی اور فرمایا کہ اگر یہ لوگ اس آگ میں کود جاتے تو ہمیشہ اسی میں رہتے۔ لیکن اب ادھر چند سالوں سے مسلمانوں میں سیاسی شخصیت پرستی اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ وہ اپنے قائدوں کے احکام اور فیصلوں کی کسی قسم کی تنقید کے لئے تیار نہیں، اور ہر غلط اور صحیح حکم کی تعمیل اور اس کی توجیہ و تاویل اپنا اسلامی فریضہ سمجھنے لگے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قائد کے احکام کی تعمیل بھی ضروری ہے اور مسلمانوں میں رائے اور اختلاف کی آزادی بعض دور میں بے اعتدالی اور فوضویت (انارکی) یا اظہار حیثیت کی حد تک پہنچ گئی تھی لیکن جب تک ائمہ مسائل اسلامی

میں اعلیٰ البصیرت اور رسوخ نہ رکھتا ہو اور سیاستِ اسلامی میں تقویٰ و تدیّن کے ساتھ تفقہ و اجتہاد کی قابلیت اُس کو حاصل نہ ہو اس وقت اپنے کو کَالمیّتِ فِی یَدِ الغَسّال (مردہ بدستِ زندہ) کے طور پر اس کے حوالہ کر دینا صحیح نہیں ہے اور بڑے عظیم دینی و سیاسی خطرات کا باعث ہے۔

یہ چند کمزور پہلو ہیں جو ہم کو اس وقت کم سے کم ہندستان کے مسلمانوں کی قومی سیرت میں نمایاں نظر آتے ہیں اور جو سیاسی جماعتوں اور مسلکوں کی حمایت یا مخالفت کے جذبہ سے بالکل علیحدہ ہو کر پیش کئے گئے ہیں۔ اس کا محرک اسلامی احساس اور دردِ دل کے سوا کچھ نہیں، اسلامی جرائد و رسائل سے گذارش ہے کہ وہ اس مضمون کو بجنسہ یا اختصار کے ساتھ شائع کر کے ایک بڑی اسلامی خدمت انجام دیں یا ان مقاصد اور معروضات کو (خواہ کچھ تنقید و اختلاف کے ساتھ) اپنے طور پر اپنے الفاظ و مضامین میں پیش کریں۔

باہتمام سیّد توسّل حسین
یونائیٹڈ انڈیا پریس نیا گاؤں لکھنؤ میں چھپا